شعورِ نبوّت

جزو دوم

۱۔ پہلی بات جو تاریخ نبوت کے مطالعے میں ہمارے سامنے آتی ہے یہ کہ نبوّت کو تاریخِ عالم سے براہ راست تعلق ہے۔ تاریخ کی ابتدا نبوّت سے ہوتی ہے۔ نبوّت سے مقصود تھا انسانیت کی تشکیل۔ نبوّت کا حصّہ انسانیت کی تشکیل میں فیصلہ کُن ہے۔ انسان کو شعورِ ذات عطا ہوا۔ اس نے تہذیب و تمدّن کی دنیا میں قدم رکھا تو اس کے ساتھ نبوّت کی بھی ابتدا ہوگئی۔ دونوں زندگی کا ایک طبعی عمل، گو بظاہر مختلف۔ یہ انبیا علیہم السلام ہی تھے جنہوں نے تاریخ کا رُخ صحت سے متعین کیا۔ وہ جب بھی آئے اُن قوتوں سے متصادم ہوئے جو مصالحِ حیات کے منافی تھیں۔ زمانے کی رو میں داخل ہوئے۔ اس کا عمل بدل دیا۔ ان کا خطاب نوعِ انسانی سے تھا اور دعوت عالمگیر جس میں جیسی کسی قوم میں ان کا ظہور ہوا، جیسا بھی زندگی میں فساد رونما تھا باعتبار اس کے انہوں نے اپنے قول و عمل سے اس کی اِصلاح کی۔ ان کے خطاب اور کردار کی نوعیت سیاسی اجتماعی تھی۔ اساس اخلاقی رُوحانی۔

۲۔ دوسری یہ کہ تاریخ ایک زمانی عمل ہے۔ اندازاور تبشیر اور نزولِ کتاب کے لئے وقت کی ضرورت تھی تاکہ نوعِ انسانی کو وہ آئینِ حیات، وہ اساسِ فکر اور اساسِ عمل مِل سکے، ایمان و یقین کی وہ دولت ہاتھ آئے جس سے اس کی تقدیر اور مستقبل وابستہ ہے، جس سے فرد اور جماعت کے روابط منضبط ہوتے ہیں۔ اِن کے اندر یہ استعداد پیدا ہوتی ہے کہ مصافِ حیات میں کامیابی سے آگے بڑھیں۔ لیکن یہ تہذیب و تمدن کا نشو و نما، یہ اظہارِ ذات کی طبعی خواہش کہ روحِ انسانی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو ایک طویل اور صبر آزما عمل ہے جو کسی رہنما ہاتھ ہی کی بدولت تکمیل کو پہنچتا۔ انسان ہدایات کا محتاج ہے اور ہدایت بالقوہ اس کے اندر موجود اسے کشاں کشاں آگے لئے جاری تھی۔ انبیا علیہم السلام آئے تو یہ ہدایت خارجاً مشہور ہوگئی۔ بہمہ وجوہ اس کے سامنے آگئی۔ اسلام نے اس ہدایت کو دین سے تعبیر کیا ہے جس کی ایک ابتدا تھی تو ظاہر ہے انتہا بھی ہوتی۔ یہ نہیں کہ اس کا سلسلہ ابداً جاری رہتا۔ انسان کبھی اطمینان کا سانس نہ لیتا نبوت کی بدولت اسے جس ہدایت کی ضرورت تھی مل گئی اور اسلام نے کہ عین زندگی ہے اس کی تکمیل کر دی۔

۳۔ تیسری یہ کہ بعثتِ انبیاؑ سے مقصود تھا نوعِ انسانی کی تعلیم و تربیت۔ اسے زندگی کے لئے تیار کرنا تاکہ وہ سمجھ لے کہ

اس کی غایت مقصود کیا ہے ۔ اس کے حصول کی صورت کیا۔ زندگی ایک بڑی تلخ اور سنگین حقیقت ہے۔ ایک تخلیقی اور پیش رس حرکت جو نت نئے مسائل لے کر سامنے آتی ہے جس میں نت نئے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ جس کے امکانات لاانتہا اور مدارج بیشمار ہیں جو کب سے بروئے کار آرہے تھے اور آتے رہیں گے ۔ ایک سے ایک غیر متوقع، ایک سے ایک حیران کن۔ ایک سے ایک احساسِ فتح مندی اور کامرانی کے باوجود تشویش اور پریشانی کا باعث، امید و بیم سے ہمکنار، تا آنکہ انسان خود اپنی ذات سے خوف کھانے لگتا ہے ۔ اپنے علم و عقل فکر اور وجدان کی جولانیوں کو دیکھ کر سر بگریباں رہ جاتا ہے ۔ سوچتا ہے زندگی کیا ہے ۔ وہ خود کیا ہے کیا ہو جائے گا۔ یہ عمل کہیں رکے گا بھی یا نہیں۔ اسے اطمینان اور آسودگی کی طلب ہے ۔ لہٰذا دو باتیں ہیں جن کی اس باب میں اسے ضرورت ہے۔ ایک ایسی منضبط اور بہمہ وجوہ منضبط شخصیت جو اس باطنی اضطراب، اس آشوب آگہی سے جس میں مفر کی کوئی صورت نہیں اسے محفوظ رکھے۔ دوسری ایک ایسی خالصاً انسانی معاشرہ جو حفظِ نوع کا ضامن ہو، جو سیاسی معاشی ذہنی اخلاقی ہر اعتبار سے فساد فی الارض کا سدِّباب کرے ۔ جس کے اقدامات سے مصالح حیات کو تقویت پہنچے ۔ انبیا علیہم السلام ایک ایسی ہی تعلیم لے کر آتے ۔ اس تعلیم نے یہ دونوں ضرورتیں بدرجۂ احسن پوری کر دیں۔ انبیا علیہم السلام کی زندگی مثالی انسانوں کی زندگی ہے ۔ وہ ہمارے رہنما ہیں ۔ ہمارے لیے نمونہ اور مثال ۔ یہ امر کہ حیاتِ ارضی میں انسان کا حقیقی مسئلہ کیا ہے، زندگی کیا ہے ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے ہر تقاضے کا رشتہ دوسرے تقاضوں سے قائم رہے ۔ ان کا تعلق ایک دوسرے سے منقطع نہ ہو۔ ان میں بظاہر جو دوئی کارفرما ہے وحدت سے بدل جائے ۔ علم اور عمل فکر اور وجدان ایک ساتھ آگے بڑھیں۔ یہ مشکل اور یہ مسئلہ صرف نبوّت نے حل کیا۔ نبوّت انسان کے لیے ایک عظیم مستقبل کی نوید لے کر آئی۔ نبوت کے علاوہ دنیا کی اور بھی تحریکوں سے نوعِ انسانی کا قدم کسی نہ کسی پہلو سے آگے بڑھا۔ لیکن یہ ایک دنیا اور ایک انسانیت کی بہمہ وجوہ عملاً تشکیل، یہ انسان کے دل و دماغ کی تربیت کہ مدارجِ حیات میں آگے بڑھے، زندگی کے جلال و جمال سے لطف اندوز ہو، اس کے امکانات بروئے کار لائے، یہ سب کچھ نبوت ہی کی رہنمائی میں ممکن تھا اور ہے ۔ انبیا علیہم السلام اس باب میں اپنا فریضہ ادا کر چکے۔

چوتھی یہ کہ یہ فرائض حیات، یہ زندگی کے مسائل اس کے گوناگوں تقاضے، مادی اخلاقی اور حیاتی ضروریات، تہذیب و تمدن کا نشوونما، اظہارِ ذات کی جبلّی خواہش، انسان، اس کا ضمیر اور باطن، قوائے علم و عمل، صلاحیتیں اور قابلیتیں، طرح طرح کے رجحانات، جذبات و احساسات کی کشمکش ان سب کی شیرازہ بندی، ان سب کا ایک نقطے پر ارتکاز کسی تعمیری مقصد کے لیے استعمال، مختصراً یہ کہ زندگی کو بہمہ وجوہ زندگی کو اس کے صحیح راستے پر ڈالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کا دار و مدار جس صداقت پر ہے ۔ انبیا علیہم السّلام اس صداقت کو ساتھ لے کر آتے ۔ یہی صداقت ہے جسے ہم علم و عقل میں استعمال کرتے ہیں۔ فکر و وجدان میں ڈھونڈتے، عمل سے اس کا سراغ لگاتے ہیں۔ کچھ پا لیتے ہیں کچھ نہیں۔ ہمارا سلسلہ

تحقیق وطلب جاری رہتا ہے۔ انبیا علیہم السّلام اس صداقت کے امین تھے اور یہ صداقت علم و حکمت، فکر و وجدان، عقل اور فہم سب پر محیط۔ انبیا علیہم السّلام پر جملہ حقائق منکشف ہیں۔ وہ بھی جو ہمارے ادراک میں آتے ہیں۔ وہ بھی جو نہیں آتے۔ اس صداقت کے سامنے فلسفی کا فکر، شاعر کا وجدان، سائنس دان کا علم، ارباب عمل کے اقدامات، بصیرت اور ہوش مندی سب ہیچ ہیں۔ ان میں کچھ معنی ہیں تو اسی صداقت کی رعایت سے جو بشکل نبوّت مشہود ہوئی۔

لیکن ابھی نبوت کے دو پہلو اور ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ انذار و تبشیر ہو، یا نزول کتاب یا حکم، مختصراً یہ کہ دین جس کا ابلاغ بتدریج ہو رہا تھا، بتدریج ہوتا جب ہی نوع انسانی میں اس کی قبولیت کی صلاحیت پیدا ہوتی جس پہلو سے بھی اس کا ابلاغ ہوا ایک قطعی اور آخری ہدایت لے کر آیا۔ کیا حضرت نوحؑ حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کے ارشادات میں کسی ترمیم یا اضافے کی گنجائش ہے؟ ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے سرچشمۂ ہدایت۔ طاقت اور دولت کی فساد انگیزیوں، فساد فی الارض اور اس کے مقابلے میں اصلاح ارض کے پیش نظر انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کیا قطعی اور آخری نہیں ہیں؟ کیا ان سے ایک ابدی صداقت کی ترجمانی نہیں ہوتی؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبوت ہر مرحلے پر قطعیت اور خاتمیت ساتھ لے کر آئی۔ اس کا ہر فیصلہ آخری فیصلہ تھا۔ ہر حکم حکم ناطق، ہر قول قول فیصل، ہر بات اپنی جگہ پر اٹل، ابدی عالمگیر اور غیر متبدل، لہٰذا نبوّت اور شعور نبوت کے فہم میں جب تک ہماری نگاہیں اس کی قطعیت اور خاتمیت پر نہیں ہوں گی ہم اس کی حقیقت سے بے خبر رہیں گے۔

دوسرا یہ کہ قطعیت اور خاتمیت چونکہ لازم و ملزوم ہیں لہٰذا دین کا ابلاغ جس مرحلے پر ہوا ایک قطعی اور حتمی ہدایت کے ساتھ ہوا۔ جو بات کہی گئی فیصلہ کن۔ لیکن اس کے باوجود سلسلہ نبوت جاری رہا۔ اس لئے کہ تکمیل دین کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔ دین مکمل ہوا تو باب نبوّت بند ہو گیا۔ وہ مقصد جس کے لئے سلسلہ نبوّت کی ابتدا ہوئی تکمیل کو پہنچا سلسلہ نبوت جاری رہتا تو نبوّت پر حرف آتا کہ نوعِ انسانی کی رہنمائی کا جو فریضہ اس کے ذمے تھا پورا نہ ہو سکا۔ نوع انسانی اندھیروں اور سایوں میں اپنا راستہ ٹٹولتی، سہارے لے لے کر، قدم قدم پر لڑکھڑاتے ڈگمگاتے آگے بڑھتی۔ ایمان و یقین سے بے بہرہ، غایت حیات سے بے خبر کبھی ایک سمت کا رُخ کرتی کبھی دوسری سمت کا، نہ شعور ذات ہوتا نہ انسان اور انسانیت کا کوئی واضح تصوّر۔ نہ اس امر کا کہ مصاف حیات میں کسی نہج پر قدم اُٹھائے۔ اس کی صلاحیتیں رائیگاں جاتیں۔ قوائے علم و عمل ساتھ نہ دیتے۔ انبیا علیہم السلام آئے انہوں نے انسان کو حق و صداقت کا سبق دیا۔ اس کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ نوع انسانی طرح طرح کی سیاسی اجتماعی، جغرافیائی اور نسلی گروہ بندیوں میں بٹی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے امتیازات و تفرقات نے اسے ایک دوسرے سے جُدا کر رکھا تھا۔ عقائد نے مسلک و مشرب کے اختلاف نے، حالانکہ تقاضائے فطرت یہ تھا کہ سب اِس وحدت کے سہارے جو بالقوہ اس میں موجود ہے ایک عالمگیر برادری، باصطلاح قرآن مجید امۃ واحدہ میں ضم ہو جائیں۔ ایک خالصاً انسانی معاشرہ وجود میں آتے۔ اس

کی اطاعت کا محور ایک ہو، آئینِ حیات ایک، راہِ عمل ایک، نصب العین ایک، قیادت ایک، سب انسانیت اس کے فروغ اور احترام پر مرتکز۔ توحید و رسالت نے اس ضرورت کو بدرجہ اتم پورا کر دیا۔ یہ ضرورت پوری ہوئی تو بقول اقبال نبوّت اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی۔ وہ مقصد پورا ہو گیا جس کے لیے اس کی ابتدا ہوئی۔ نزولِ کتاب نے ہماری راہِ عمل متعیّن کر دی۔ علم و عقل کو اس کے صحیح راستے پر ڈال دیا۔ یوں نبوّت نے خود اپنے خاتمے پر مہرِ خاتمیت ثبت کر دی۔ نبوت کی خاتمیت جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی خاتمیت ہے۔ مگر یہ خاتمیت ہے کیا؟ آیئے اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

بادی النظر میں اس خاتمیت کے معنی ہیں سلسلہ نبوّت کا خاتمہ کہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نوعِ انسانی کے آخری نبی ہیں۔ آپؐ کے بعد سلسلہ نبوت ختم ہو گیا۔ اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ حقیقت میں یہ کہ ہم صرف آپؐ کے اتباع کے مکلف ہیں۔ آپؐ کے بعد کسی شخص کے اتباع اور اطاعت خواہ اس کا دعویٰ کچھ ہو، درجہ اور مرتبہ کچھ، نبوّت کی کیسی بھی تعبیر کی جائے مکلف نہیں اگر کہا جائے۔ آپ ہی کے اتباع کی خاطر جب بھی اس کا کوئی جواز نہیں۔ اتباع در اتباع کی یہ منطق ہی غلط ہے۔ اصل عتماد کے منافی کہ ہم جس اتباع و اطاعت کے مکلف ہیں۔ اس کا ملاً شعور ہے حالانکہ یہ شعور ہی تو ختم نبوت کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ یہ شعور چھن گیا۔ ہم نے کوئی ایسا دعویٰ قبول کر لیا تو جس اتباع و اطاعت کے ہم از روئے شریعت مکلف ہیں صاحبِ دعویٰ ہی اس کا مکلف ٹھہرے گا۔ ہم اسی کا اتباع اور اطاعت کریں گے لفظاً نہ سہی معناً اور یہ ختم نبوّت کا انکار۔ دراصل توحید کی طرح تقاضائے رسالت بھی یہ ہے کہ جیسے تعلق باللہ کے لیے ہم کسی واسطے کے محتاج نہیں اتباعِ رسول میں بھی ہمارا تعلق براہ راست رسالت سے قائم رہے۔ واسطے پر اصرار ہے ایک رہنمائی دوسری رہنمائی پر منحصر ہو تو یہ دینی پیشوائی ہی کی ایک شکل ہو گی جسے اسلام نے توحید ہو یا رسالت دونوں صورتوں میں ہمیشہ کے لیے رد کر دیا۔ توحید و رسالت سے براہ راست تعلق ہی ہماری شخصیت کے نشوونما اور مدارج ذات میں آگے بڑھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ نبوّت سے غرض ہے ایک ایسی اخلاقی فضا کی تخلیق جس میں پرورش پا کر انسان مدارجِ کمال میں آگے بڑھتا ہے۔ لیکن یہ جب ہی ممکن ہے کہ ہم براہ راست اس سے اکتساب فیض کریں۔ نبوّت کا فیض عام ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت عام۔ یاد رکھیے ختم نبوّت کوئی عقیدہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت۔ عقیدے کی تو کئی تاویلیں ممکن ہیں اس کا انکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت کا انکار ممکن نہیں۔ ختمِ نبوّت ایک اساس فکر و عمل ہے۔ ایک رہنما اصول، ایک معیارِ حق و صداقت، ایک نمونہ کردار و سیرت جس کے حوالے سے ہم اپنے علم و عمل، عقل اور فکر کا رُخ صحت سے متعین کرتے رہتے ہیں۔ راہ راست سے ہٹنے نہیں پاتے۔

رہے صوفیہ کے رُوحانی مشاہدات ان میں اور انبیا علیہم السلام کے مشاہدات میں باعتبار واردات جو صوری مشابہت ہے ان کی بنا پر مطلق یا اضافی نبوت کا کوئی بھی دعویٰ قابلِ تسلیم نہیں۔ شعورِ نبوّت اور شعورِ ولایت کی نوعیت

جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہے۔ نبوت محض مکالمہ اور مخاطبہ، یا کشف والہام نہیں ہے کہ اس کا سہارا لیتے ہوئے تشریعی اور غیر تشریعی یا ظلی اور بروزی نبوت۔ یا از روئے زہد و ورع کسی شخص کے لیے اس طرح کے کسی منصب کا امکان پیدا کیا جائے۔ یہ اصطلاحیں ہماری وضع کردہ ہیں۔ قرآن مجید سے اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ بقول اقبال یہ ارمنہ متوسط کی زوال پذیر فضا کی پیداوار ہیں۔ الٰہیات اور تصوف میں سخن ارائیاں مغالطے اور سفسطے۔ قرآن مجید نے نبوت کو صرف نبوّت کہا ہے۔ اس کی اقسام نہیں گنوائیں۔ وہ ایک یگانہ اور یکتا مظہر ہے جس کی کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں۔ حضرات صوفیہ نے ایسا ضرور لکھا ہے کہ انسانی درجہ نبوت تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن یہاں نبوت سے ان کا مطلب وہ روحانی مقام ہے جو تعلق باللہ کی بدولت کسی کو حاصل ہو جاتا ہے۔ گویہ خیال بھی اس غلط نفسیات پر مبنی ہے جس کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔ مگر پھر اس کے باوجود اس نبوت کو ان معنوں میں نبوت نہیں کہتے جن معنوں میں قرآن مجید نے نبوت کو نبوت کہا ہے۔ وہ صرف ایک روحانی مقام کا ذکر کر رہے ہیں۔ گو اس کے لیے لفظ نبوت سے احتراز ہی واجب تھا۔ بہر حال حضرات صوفیہ نے کسی رنگ میں بھی تسلیم نہیں کیا کہ ختم نبوّت کے بعد اجرائے نبوّت کی کوئی ایسی شکل بھی ممکن ہے جس میں نبوتِ محمدیہ کی خاتمیت اور قطعیت کے باوجود کسی مدعی نبوّت کا بے چوں وچرا اتباع شرعاً ضروری سمجھے۔

اقبال نے کہا ہے اور از روئے قرآن مجید نہایت ٹھیک کہ نبوت ایک سیاسی اجتماعی ادارہ بھی ہے۔ اور اس سے مقصود ایک امت کی تشکیل جس کی کوئی اساس اور کوئی نصب العین ہے تو یہ ایک ہی فرد ہوگا جس کے ہاتھوں اس کی تشکیل ہوگی۔ وہی اس کا موسس ٹھہرے گا۔ اسی کی قیادت فرد اور جماعت کے اتحاد اور ارتباط کا سرچشمہ بنے گی۔ اسی کا عمل اس جدّوجہد میں جو اُمّت کے حفظ و استحکام اور اس نصب العین کے حصول میں جو اُمّت اس کے سامنے ہے نمونہ اور مثال، لہٰذا ہر اعتبار سے حجت ٹھہرے گا۔ اس قیادت میں کسی دوسری قیادت سے نہ صرف فتنہ و فساد اور انتشار و اضلال کو تحریک ہوگی بلکہ وہ نصب العین بھی جس کے لیے اس کی تشکیل ہوئی آنکھوں سے وہ اوجھل ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ لہٰذا ختم نبوت کی کوئی ایسی تعبیر جس سے ایک نئی قیادت ظہور میں آئے۔ اتباع در اتباع میں نبوت کو ایک نئی شکل دی جائے۔ اُمت در اُمت کے لیے ایک نیا جواز نکل آئے ایک وابستگی کا رشتہ دوسرے وابستگی سے جوڑنا لازم ٹھہرے۔ اس سیاسی اجتماعی ادارے کی نفی ہے جو از روئے نبوّت معرضِ وجود میں آیا۔ بقول اقبال ختم نبوت اس قسم کے انتشار پسند رجحانات کے خلاف ایک نفسیاتی روک بھی ہے تاکہ امت کی جمعیت، اس کی مرکزیت اور نظم و ضبط میں فرق نہ آئے۔ ختم نبوّت سے یہ بھی مقصود ہے کہ امت کا نشوونما اس کے طبعی اور فطری نہج پر جاری رہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر شخص کو حریّت رائے کا حق دیا۔ اسلامی معاشرہ ایک روحانی جمہوریت ہے۔ اختلافِ اُمتی رحمت۔ اختلاف رائے ہی سے بحث و نظر کے مختلف گوشے بے نقاب

ہوتے ہیں۔ پھر جب ذات الٰہیہ سے ہمارا براہ راست تعلق ہے۔ نبوت کے ہم براہ راست متبع تو ہم سے اختلاف رائے کا حق نہ چھینے۔ اختلاف رائے تقاضائے فطرت ہے۔ آزادیٔ ضمیر کی علامت۔ ادعا و تحکم کی نفی۔ چنانچہ دین کی تکمیل ہوئی تو باب نبوت بند ہوگیا۔ باب نبوت بند ہوا تو باب اجتہاد وا ہوگیا۔ اجتہاد ایک اجتماعی عمل ہے۔ امت کی رہنمائی بھی ایک اجتماعی عمل۔ اس راہنمائی میں دوسرے لفظوں میں ایک قدر مشترک نصب العین کے حصول کی جدوجہد کا سررشتہ بھی اُمت ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی خاص فرد یا جماعت کے ہاتھ میں نہیں۔ رسالت کی رہنمائی ابدی ہے۔ بلا قید و بلا شرط۔ تقاضائے فطرت بھی یہی ہے کہ جب کوئی رہنما اصول ہاتھ آجائے تو اسے جوں کا توں قائم اور برقرار رکھیئے۔ تاویلات و تعبیرات کا سہارا لیا تو ذہن الجھ کر رہ جائے گا۔ اختلاف و انتشار بڑھے گا۔ لہٰذا اقامت دین ہو یا احیائے اُمت کا اس کی اصلاح و تطہیر کا کوئی دعویٰ جس سے دین کے معاملے میں نبوت کی رہنمائی کسی شخص کی ذات میں محدود ہو کر رہ جائے۔ اس کا قول و فعل حجت ٹھہرے۔ افرادِ اُمت میں ایک خط امتیاز کھینچ دے۔ ختم نبوت کے منافی ہے۔ خواہ دانستہ خواہ نادانستہ۔

پھر جب نبوت ایک سیاسی اجتماعی ادارہ ہے سیاست اور جہانبانی کی اساس۔ فرد اور جماعت کے لئے منظم اور منضبط زندگی کا ایک اصول۔ اس سے مقصود ہے ایک ایسی سیاسی اجتماعی ہئیت بالفاظ قرآن مجید اس امہ واحدہ، اس اجتماع بشری کی تشکیل جس کی دعوت انبیا علیہم السلام نے دی اور جس کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے ہوئی۔ نوع انسانی ایک ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی ہیں ایک۔ طرح طرح کے مادی اخلاقی اور سیاسی عمرانی رشتوں سے باہم دیگر وابستہ۔ اقطاع عالم میں بکھرا ہوا، لیکن اس کے باوجود فرد کا رشتہ فرد سے کٹ سکتا ہے۔ نہ قوموں کا قوموں سے۔ سب بالطبع اس وحدت کی طرف مائل جو بالقوہ ان کے اندر موجود ہے۔ سب ایک دوسرے سے تعاون اور مشارکت اور تعاون ہی کا ایک عمل ہے۔ اس کا تقاضا ہے وحدت انسانی اور وحدت انسانی کا تقاضا ایک عالمگیر نظام مدنیت۔ پھر جب ایک ہی صداقت ہر کہیں کارفرما ہے۔ انسان میں، کائنات میں، علم و حکمت میں، اخلاق و معاشرت، سیاست اور اجتماع میں تو کیوں نہ نظام مدنیت بھی ایک ہو۔ ایک ہی تو قانون ہے جو اس کے حفظ و استحکام میں حصہ لیتا ہے۔ ہم اسی کے حوالے سے قوموں کے نیک و بد پر حکم لگاتے، ان کی ترقی اور تنزل کی تشریح کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تاریخ عالم کی ورق گردانی کیجئے تو نوع انسانی کی شقاوت اور درندگی کا ایک لرزہ خیز منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو تاریخ کا ایک مثبت رُخ بھی تو ہے۔ وہ تعمیری عمل کہ جس قوم کو بھی ذہنی اخلاقی برتری حاصل ہوئی۔ تہذیب و تمدن، سیاست اور جہاں بانی میں دنیا پر چھا گئی اس کی ہمیشہ کوشش رہی کہ جو بھی قوم ہے اس کی رہنمائی قبول کر لے۔ وہ سمجھتی تھی انسان کا مستقبل اسی کے ہاتھ میں ہے۔ امن و امان آسودگی اور خوش حالی اسی کے دم سے قائم۔

ایک زمانے میں یہی دعوے قیصر و کسریٰ نے کیا۔ انگلستان کو بھی اپنے زمانہ عروج میں کچھ ایسا ہی زعم تھا کہ امن عالم کا سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ انجمن اقوام اور اقوام متحدہ کا قیام بھی اسی مقصد کے لیے عمل میں آیا۔ معلوم ہوتا ہے فطرت کشاں کشاں ہمیں اس وحدت کی طرف لئے جا رہی ہے جس کا تقاضا ہے ایک مشترک نظام مدنیت، ایک عالمگیر اجتماع بشری، ایک امۃ واحدہ لیکن ابھی منزل مقصود دور ہے۔ بہت دور۔ مقصد ایک ہے۔ رہنما بہت۔ رہنمائیاں کئی۔ ہر ایک کی اپنی ایک اساس۔ اپنا ایک نصب العین۔ اپنا ایک نتیجہ اور راستہ اور نتیجہ اس کا اتحاد کی بجائے افتراق۔ ختم نبوت سے البتہ وہ رہنمائی جو ہمہ وجوہ مکمل ہے اور جس نے انسان کے لئے اتحاد و ارتباط، مشارکت اور تعاون کا راستہ کھول دیا۔ ہر پہلو اور ہر جہت سے نمایاں اور واضح ہو گئی۔ ختم نبوت سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ جو تقدیر انسانی کا رشتہ ایک نہیں کئی ہاتھوں میں ہے۔ اس میں کئی تفریقات ہیں، کئی امتیازات۔ ہر ایک میں ایک نئی وابستگی ایک نئی ارادت اور عقیدت۔ ان سب کو ایک رہنمائی میں ضم کر دیا جائے۔ انسان ایک ہی رہنما کے سہارے غایت مقصود کی طرف بڑھے۔ نبوت سے مقصود تھا نوع انسانی کی رہنمائی۔ نبوت حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر ختم ہو گئی۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اب نوع انسانی کے رہنما ہیں۔ مرشد اور معلم۔ آپؐ ہی کی قیادت اور امامت تقدیر انسانی کی امین ہے۔ آپؐ کی رہنمائی میں سب رہنمائیاں جمع ہیں۔ یہی رہنمائی دعوت ابراہیمی کی وارث ہے اور یہی رہنمائی جس کا دوسرا نام ہے ختم نبوت وحدت انسانی کی اساس

اب اگر ختم نبوت وحدت انسانی کی اساس ہے ختم نبوت ہی کی بنا پر اس امت یعنی اُمت اسلامیہ کی تشکیل ہوئی جو گویا تمہید ہے جمعیت بشری بالفاظ دیگر انسان کے ہاتھوں، انسانوں ہی کے انسانوں کے ایک اجتماع کی جسے بفحوائے "اخرجت للناس" خیر امت کہا گیا۔ جس کی وابستگی کسی سرزمین سے ہے، نہ قوم اور نسل سے۔ برعکس اس کے وہ ایک نصب العین ہے تو اس امت کی اساس بھی ختم نبوت پر قائم ہے۔ ختم نبوت ہی اس کی تقویم اور تقویت کا راز۔ اس اُمت کی تشکیل اس لئے ہوئی کہ جملہ اقوام عالم انسانیت کے نام پر جمع ہو کر ایک ایسی ہیئت اجتماعی کی شکل اختیار کر لیں۔ جس کا تشخص خالصاً اسلامی ہو۔ جس کی بنا ان ابدی اور عالمگیر اصولوں پر رکھی گئی جو معاشرے کے حفظ و استحکام اور نشوونما کے ضامن ہیں۔ لہٰذا اس اُمت کے اندر کوئی ایسی اُمت یا ایسی جماعت جس سے اس کی وحدت میں فرق آئے۔ ہم اس کے اصول و قانون کی تعمیر اپنی رائے، ذاتی خیالات اور رجحانات کی بنا پر اس دعوے سے کریں کہ اس کے سوا کوئی دوسری تعبیر ممکن ہی نہیں۔ ہمیں بہرحال اسے قبول کر لینا چاہیئے۔ ہمارا ایک جداگانہ تشخص ضروری ہے تو یہ مصالح اُمت کی نفی ہو گی۔ رجعت پسندی اور تاریک خیالی۔

بایں ہمہ عقیدہ ختم نبوت یا یوں کہیئے کہ نبوت محمدیہ کی خاتمیت کہ عبارت ہے اسلامی تعلیمات کی قطعیت اور حتمیت سے بہت کم سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اقبال نے البتہ اس باب میں جو اشارے کئے ہیں نہایت درجہ معنی خیز ہیں۔

یہ خاتمیت زندگی کی پیش رس اور آزادانہ تخلیقی حرکت میں حائل نہیں۔ اس نے ہمارے علم وعقل پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ ہم سے ارادے انتخاب اور اختیار کا حق نہیں چھینا۔ برعکس اس کے عقل وفکر کی کارفرمائی کو اس کے صحیح راستے پر ڈال دیا۔ کائنات کے مطالعے کی دعوت دی۔ ہمیں اپنے مرتبہ ومقام سے آگاہ کیا۔ انسان اپنے اپنے گرد وپیش سے خائف تھا۔ حزن ویاس کا شکار، اندھیروں اور سایوں میں گھرا ہوا۔ خودساختہ تفریقات وامتیازات، رسوم وقیود کے حصار میں مقید حیران وسرگرداں پھر رہا تھا۔ نبوّتِ محمدیہ نے اسے خوف سے نجات دلائی۔ یاس وحزن کو مسرت اور امید سے بدل دیا۔ اسے آزادی اور اختیار کی دولت دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہی اس لئے ہوئی کہ جن زنجیروں نے انسان کو جکڑ رکھا ہے توڑ دی جائیں۔ اِس بوجھ کو ہٹا لیا جائے جس کے نیچے وہ دب رہا ہے۔ اب اس کے راستے میں کوئی روک نہیں۔ بجز اس کے جو زندگی نے اپنی کارفرمائی کے لئے آپ کی تجویز کر رکھی ہیں۔ اور جسے اسلام نے شریعت سے تعبیر کیا ہے۔ زندگی ایک ہی اصول کی تابع ہے۔ اس کا ایک ہی قانون ہے، ایک نظم وضبط، ایک ہی راستہ جسے نبوتِ محمدیہ کی خاتمیت نے ہمیشہ کے لئے متعین کر دیا۔ نبوّتِ محمدیہ کی خاتمیت ایک احسان عظیم ہے نوعِ اِنسانی پر۔ یہ اس کی آزادی اور استخلاص کا پروانہ ہے۔ شرفِ ذات، خود اعتمادی، خودداری اور خودگری کا منشور۔

اقبال نے لکھا ہے نوع انسانی بلوغ کو پہنچ گئی تو قدرتی بات تھی کہ نبوّت اپنے خاتمے پر آپ ہی مُہرِ خاتمیت ثبت کر دے۔ انسان کی مزید رہنمائی کے انتظار میں مذبذب اور مضطرب نہ رہے۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ ہو۔ وُہ اس رہنمائی کے سہارے جو اسے ملی اپنی زندگی کا بوجھ آپ اُٹھائے۔ اپنے وسائل سے کام لے۔ اس کے شعورِ ذات کی تقویت کا اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ یونہی وہ اپنے فرائض اور ذمے داریوں کو سمجھتا۔ اپنا سررشتۂ تقدیر اپنے ہاتھ میں لیتا۔ یونہی اس کے اندر ایک محکم اور مستقل شخصیت کی تعمیر ممکن تھی۔ یونہی وُہ مدارجِ حیات میں آگے بڑھتا۔ آئینِ فطرت بھی یہی ہے کہ انسان اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہو۔ سہاروں کی تلاش نہ کرے۔ اسے وہ سب کچھ ملا ہے جس کی اسے ضرورت ہے۔ عقل وفکر، سمع وبصر، وہ اپنی سوچ سمجھ، اختیار وانتخاب سے کام لے گا تو جب ہی اس کا جوہرِ ذات کھُلے گا۔ ختمِ نبوّت سے اِسے وہ رہنمائی مل گئی جس کی اسے احتیاج تھی۔ غور سے کام لیجئے تو زندگی کو ہر مرحلے اور ہر مرتبے پر رہنمائی کی ضرورت رہتی ہے، مگر قطعیت اور حتمیت کے ساتھ تاکہ وہ بہ اعتماد آگے بڑھ سکے۔ آگے بڑھنا اس کی فطرت ہے۔ حرکت اس کی رُوح، سکون موت، اس کی نوعیت تخلیقی ہے، ارتقائی اور غائی، اِسے کوئی ایسی قید گوارا نہیں جس سے اس کی کارفرمائی میں فرق آجائے۔ لیکن اس کارفرمائی ہی کا تقاضا ہے کہ جب بھی آگے بڑھے کسی ایسی رہنمائی کے سہارے جو اسے بے راہروی سے روک دے۔ رسالتِ محمدیہ کی خاتمیت ایک ایسی ہی قطعیت اور خاتمیت کو ساتھ لے کر آئی جس سے زندگی کا قدم آگے بڑھتا ہے۔ پیچھے نہیں ہٹتا۔ اقبال نے ٹھیک کہا ہے زندگی میں ثبات بھی ہے، تغیر بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں کا رشتہ ایک دوسرے سے قائم رہے۔ کچھ ایسا ہی

معاملہ قطعیت اور آزادی کا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر۔ ہم اس حقیقت پر نظر رکھیں تو اس قسم کی خاتمیت اور قطعیت کی ایک نہیں کئی مثالیں مل جائیں گی۔ علم و حکمت کی دنیا میں، سیاست و اجتماع میں۔ نبوت محمدیہ کی خاتمیت از اوّل تا آخر ساری زندگی پر حاوی ہے۔ یہ زندگی کا تقاضا ہے۔ اس کی اپنی ضرورت تاکہ اسے اعتماد حاصل ہو۔ اس کا قدم صحیح راستے پر اُٹھے۔ اپنے مقصود و منتہا سے بے خبر نہ رہے۔

میرے اس مقالے کا موضوع تھا شعور نبوّت۔ لیکن شعور نبوّت سے ہمارا ذہن قدرتاً شعور ولایت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جیسے نبوّت سے ختم نبوّت، اس کی خاتمیت اور قطعیت کی طرف۔ اقبال نے شعور نبوّت اور شعور ولایت دونوں پر نظر رکھتے ہوئے اوّل شعور نبوّت اور شعور ولایت میں باعتبار نفسیات جو بنیادی فرق ہے اس کی رعایت سے شعور نبوّت کی وضاحت کی تاکہ ہم سمجھ لیں اس کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے۔ واردات استحاد اور بازآمد ایسے الفاظ سے شعور نبوّت کی مخصوص اور منفرد حیثیت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ پھر اس ثقافتی دنیا کی طرف اشارہ کیا جس کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے ہوا۔ فلسفیانہ اعتبار سے یہ دونوں نقطہ نظر یکساں اہم ہیں کیونکہ ایک دوسرے کی توجیہ و تشریح کا پہلو نکلتا ہے۔ لیکن میری توجہ اسی باب میں شعور و نبوّت کی اہمیت اور نوعیت ہی پر مرتکز رہی اور یہی اس مقالے کا موضوع۔ لہٰذا میں نے بعض ایسے مسائل پر اعتبار نہیں کیا جن کی حیثیت بنیادی ہے۔ مثلاً وحی یا تنزیل کا مسئلہ ہے۔ یا بعض ایسی بحثیں جن کی نوعیت مابعد الطبیعی ہے، تاریخی اور عمرانی بھی۔ البتہ شعور نبوّت کی بحث میں نبوت اور ختم نبوّت کی بحث ناگزیر ہو گئی۔ اس لئے کہ نبوت سے جس بحث کا آغاز ہوا سمجھ میں آ جائے تو ختم نبوّت کا فہم دشوار نہیں رہا۔ نہ اس امر کی کہ ہمارے علم و عمل، عقل اور فکر کے لئے اس کے معنی کیا ہیں، ثقافت کے لئے کیا۔ ثقافت کا تعلق اگرچہ سیاست و اجتماع، اخلاق اور معاشرت سب سے ہے۔ مگر بالخصوص اس امر سے کہ روح انسانی اپنے خارج کی دنیا میں تمام و کمال مشہود ہو سکے۔ میری رائے میں اقبال ہی نے سب سے پہلے ختم نبوّت کا رشتہ ثقافت سے جوڑا۔ اور اس کی اہمیت واضح کی۔ اس انقلاب کی طرف اشارہ کیا جو اس طرح تہذیب و تمدن کی دنیا میں رونما ہوا۔ اور جس سے اس کا رُخ نوع انسانی کی وحدت اور زمانے کی حقیقت کی طرف مُڑ گیا۔ ہم نے ختم نبوّت کو محض عقیدتاً مان لیا۔ یہ دیکھا ہوتا زندگی کے لئے اس کے معنی کیا ہیں تو نبوّت کی حقیقت اور غرض و غایت بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ رہتی۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ تشکیل جدید کا پانچواں اور چھٹا خطبہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ مسائل اور وہ حقائق بھی جن کی طرف اس اقبال نے اس بحث میں اشارہ کیا ہے۔

البتہ ایک بات ہے جس کا اسلام کی ثقافتی روح کی پیش نظر لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اور جو تاریخ عالم میں نوع انسانی کو جن حالات سے گذرنا پڑا باعتبار ان کے بغایت اہم بات یہ ہے کہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاریخ کا رُخ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صحت سے متعین کر دیا۔ یوں جس تاریخی عمل کا آغاز ہوا اس کی حیثیت دوگونہ ہے۔

ایک سیاسی اجتماعی جس کا رُخ انسانی وحدت کی طرف ہے۔ دوسرا اخلاقی روحانی جس سے مقصود تھا نوع انسانی کی ہر اس بُرائی سے استخلاص جس نے فرد اور جماعت کی زندگی میں نزاع اور فساد پیدا کر رکھا تھا۔ انسان اپنا شرف ذات کھو بیٹھا تھا۔ اس کی زندگی میں ناانصافیوں اور ناہمواریوں، غضب و استحصال اور جبر و قہر کا دور دورہ تھا۔ فرد افراد اور قومیں قومیں سے متصادم ہو رہی تھیں۔ اور اس کی وجہ ریاست اور کلیسیا کی چیرہ دستیاں بادشاہت، دینی پیشوائی، نسل، وطن، رنگ، خون اور حسب و نسب کی بنا پر فرق مراتب، اونچ نیچ۔ حالانکہ وحدت انسانی کی روح ہے انسان۔ انسان کی انسان کے لئے قدر و منزلت، دردمندی اور دلسوزی۔ حریت، آزادی، اخوت مساوات اور عدل و احسان اس کی شرط لازمی لہٰذا ضروری تھا کہ ریاست اپنی حقیقی اساس پر آجائے۔ کلیسا کی دستبرد قائم رہے، نہ خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی روک نہ انسان اور انسان کے درمیان کوئی حد بندی۔ انسانیت کا وقار مجروح نہ ہونے پائے۔ حریت مساوات آزادی اخوت اور عدل و احسان ایک حقیقت بن کر معاشرے میں نفوذ کر جائیں۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو یہ سب مقاصد بدرجہ اتم پورے ہو گئے۔ نوع انسانی کی سیاسی اجتماعی وحدت اور روحانی اخلاقی استخلاص کا عمل اپنے جملہ امکانات اور مضمرات کے ساتھ شروع ہو گیا۔ اسلام اس معاملے میں ایک مثبت اور فیصلہ کن قدم اُٹھا چکا ہے۔ وہ ہیئت اجتماعیہ اور وہ آئین حیات آپ کے سامنے ہے جس کی اس طرح تشکیل ہوئی۔ ہمیں چاہیئے اس تاریخی عمل میں جہاں ہماری نظر اسلام اور اسلامی دنیا سے باہر عالم انسانی پر ہو، یہ دیکھیں یوں اس کے لئے کیا نتائج مترتب ہوئے، وہاں اس امر پر بھی کہ وہ آج بھی کس طرح امور انسانی میں کارفرما ہے۔ ہم نہیں بھولیں اس عمل کے لئے غیر معمولی دردمندی خلوص اور ایثار کی ضرورت ہے اور یہی انسان کی انسان کے لئے خیر خواہی، بالفاظ دیگر شرافت اور انسانیت میں نہایت کڑا امتحان جس کا نمونہ ہمیں انبیا علیہم السلام کی زندگی سے ملتا ہے۔ یہ ایک عظیم نصب العین ہے اور اس کے حصول کی بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اور اسوۂ حسنہ کا صدق دل سے اتباع کریں۔ آپ نوع انسانی کے محسن اعظم ہیں۔ جس طرح اسلام زندگی کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے، حضورؐ کی ذات گرامی نوع انسانی کے لئے سب سے بڑی رحمت۔

میں سمجھتا ہوں اب ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں ہوگا کہ شعور نبوّت شعور کا بلند ترین مرتبہ ہے۔ معناً شعور کے جملہ مراتب پر حاوی جن میں کبھی ہم اپنے داخل اور کبھی خارج کی دنیا کا رُخ کرتے ہیں۔ سائنس کے دست نگر رہتے فکر و وجدان تاریخ، احوال عالم اور اپنے دل کی دنیا کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ شعور نبوّت نے ہر اس شعور کو سمیٹ لیا ہے جو انسان بالارادہ اپنے علم و عقل، تجربات اور مشاہدات سے حاصل کرتا ہے۔ یہ شعور ان سب پر محیط ہے۔ عین علم ہے عین صداقت، سرتاسر ایمان و یقین، عمل اور اقدام کا سرچشمہ۔ اس میں حرکت ہے زندگی ہے۔ وہ خود ایک قوت ہے۔ ہمارے لئے قوت۔ پھر جب نبوّت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ خالق اور مخلوق کا رابطہ ہر لحاظ سے ہر لمحہ

قائم ہے۔ خواہ ہمیں اس کا شعور ہے یا نہیں تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ رابطہ حبیبی بھی اس کی سطح ہے علم کا ذریعہ ہوگا۔ اسلامی تصوف کی روح بھی یہی ہے کہ اس حق کی تصدیق و تثبیت ہوتی رہے۔ جو انبیا علیہم السّلام کے توسّط سے ہمیں پہنچا اور یہی تصدیق و تثبیت مومن کے لئے اخلاص فی العمل کا سرچشمہ، کس قدر فرق ہے حق کو بطور ایک فلسفیانہ تصوّر یا منطقی قضیئے یا عقیدۃ مان لینے اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے، بالفاظ اقبال خبر اور نظر، یا حقیقت کا دور ہی سے مشاہدہ کرنے اور اس سے تقرب اور اتصال میں۔ انبیا علیہم السّلام کی ذات میں یہ رابطہ چونکہ انتہائی کمال کو پہنچ گیا، لہٰذا شعور کے اس انتہائی مرتبے کا سرچشمہ جس میں ازل سے ابد تک زمانے کی ساری وسعتیں ماضی حال اور استقبال سمٹ کر ایک نقطے پر آجاتے ہیں۔ انبیا علیہم السّلام ہر حقیقت اور ہر صداقت کو اپنے سامنے عیاں دیکھتے ہیں۔ شعور نبوت سے آگے علم کا کوئی مرتبہ نہیں۔

لیکن ایک بات ہے جس کا شعور نبوت کی قطعیت اور خاتمیت کے فہم میں لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس شعور کو اگرچہ انبیا علیہم السلام ہی سے نسبت دی جائے گی۔ مگر وہ عبارت ہے جس علم سے انبیا علیہم السلام کی ذاتی کاوشوں عقل و فکر، محسوسات و مدرکات سے سرتاسر بے تعلق۔ کیونکہ اس کا سرچشمہ ہے وحی و تنزیل۔ لہٰذا از اوّل تا آخر من عنداللہ، قطعی اور یقینی۔ انبیا علیہم السلام کی وارداتِ اتحاد گویا حصولِ علم کی واردات ہیں جن سے بلا منت تصدیق و تائید ان کے شعور کی دنیا متشکل ہوتی ہے۔ یہ علم ان کے قلب پر ثبت ہو جاتا ہے بجائے خود ازدیادِ علم کا ذریعہ بنتا ہے پھر اگر یہ علم تمام تر من جانب اللہ ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ علم کی استعداد بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے علم الانسان مالم یعلم۔ پھر علم کے بھی مدارج ہیں۔ انسان کو علم ملا لیکن بہت کم۔ مولانا روم کہتے ہیں:۔

قطرۂ دانش کہ بخشیدی ز پیش
متصل گرداں بدریا ہائے خویش
پیش ازاں کان خاک ہا خسفش کنند
پیش ازاں کان بادہا نسفش کند

تاکہ انہیں علم کا جو قطرہ عطا ہوا اس علم سے جا ملے جس کی کوئی انتہا نہیں ذات الٰہیہ ہی علیم و خبیر ہے۔ علم الٰہی نے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ یہی تمام تر علم ہے۔ اب اگر کسی انسان کی تعلیم و تربیت کا سررشتہ اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے اس کا قلب وحی و تنزیل کا مہبط جیسے انبیا علیہم السّلام کی صورت میں تو اس طرح اسے جو علم حاصل ہوگا۔ اسے علم کا منتہائے کمال ہی کہا جائے گا۔ یہ علم بذریعہ وحی و تنزیل انبیا علیہم السّلام کو پہنچا۔ صحف سماوی میں منتقل ہوتا رہا اور اب تمام و کمال قرآن مجید میں محفوظ۔

لیکن ایک خلش ہے جسے شاید آپ بھی محسوس کر رہے ہوں گے اور وہ یہ کہ شعورِ نبوت کے اس مختصر سے بیان میں میں نے بار بار شعورِ ولایت کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ وہ احوال اور واردات جو شعورِ ولایت کا تار و پود ہیں اور ہمارے لئے علم کا ایک ذریعہ دوسروں کے لئے تو درکنار خود اہلِ ولایت کے لئے بھی حجت نہیں۔ ہمیں ان کی تنقید و جرح و قدح کا حق حاصل ہے۔ بلکہ چاہیں تو ان سے بالکل اعتنا نہ کریں۔ برعکس اس کے جو شعورِ نبوت کا حاصل ہے وہ تعلیمات جو قطعی اور آخری ہیں اور جن کو ہم بے چوں وچرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ ہم ان پر اعتراض نہیں کریں گے۔ ہاں از روئے علم و عقل ان کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جو از روئے قرآن مجید ہمارا فرض بھی ہے۔ پھر جب نبوت ایک منصب ہے، ولایت ایک مقام اور ایک تجربہ، خواہ ہم اس کو مانیں، خواہ نہ مانیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعورِ نبوّت کی موجودگی میں شعورِ ولایت کی اہمیّت یا یوں کہیئے اسلام میں تصوّف کا مقام کیا رہ جاتا ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ یہی سوال آپ سائنس اور فلسفہ، شاعری غرض کہ علم و عقل، فکر اور وجدان مختصراً علم انسانی کی ہر شکل کے بارے میں کر سکتے ہیں۔ ہم کہیں گے شعورِ نبوّت کی موجودگی میں اس شعور کی جو ہمیں ان ذرائع سے حاصل ہوتا ہے کوئی قدر و قیمت ہے بھی یا نہیں۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اگر شعورِ نبوّت کا خود بھی تقاضا ہو کہ ہم اس کے فہم میں شعور کے ان سرچشموں کا رُخ کریں تو ان کی ضرورت اور اہمیّت کا آپ ہی آپ اقرار کرنا پڑے گا۔ پھر اگر ان سرچشموں کے علاوہ علم کا کوئی اور بھی ذریعہ ہے مثلاً وہ تجربات جن کی نوعیت روحانی ہے۔ اور جن میں ہم براہ راست حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم تم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ علم نتیجہ ہے کسی حقیقت سے اتصال کا۔ جیسے کائنات سے بذریعہ حواس اتصال ہمارے لئے علم کا ایک ذریعہ ہے۔ اب اگر کائنات بجائے خود ایک آیت ہے ذاتِ الٰہیہ کی جو ہماری رگِ جان سے بھی قریب ہے۔ تو اس سے اتصال بھی علم کا ایک سرچشمہ۔ انسان کو بالطبع حقیقت کی جستجو ہے۔ وہ اس کے فہم و ادراک پر قناعت نہیں کرتا۔ اس سے اتصال و قرب کا آرزومند رہتا ہے۔ اس کی دید کا مشتاق۔

نمی گردد کہن افسانہ طور
کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

لہٰذا اگر کسی سائنسدان کے علم، کسی فلسفی کے فکر اور کسی شاعر کے وجدان میں ہمیں حقیقت کی کوئی جھلک نظر آتی ہے جو اپنے رنگ میں وارداتِ باطن ہی کی ایک شکل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں یوں ہم اس حقیقت سے قریب ہو رہے ہیں جس سے اتصال کی تمنا ہر شخص کے دل میں ہے تو اگر کسی صوفی کے احوال و واردات اور مشاہدات اس باب میں ہماری رہنمائی کریں۔ ہم سمجھیں ہم بھی اپنی کوشش اور محنت سے ایسا کوئی تعلق پیدا کر سکتے ہیں تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر شخص اس کا اہل نہ ہو۔ سائنس فلسفہ اور شاعری کا بھی تو ہر کوئی اہل نہیں ہوتا۔ علم کا معاملہ خواہ کسی رنگ میں ہو استعداد کا معاملہ ہے۔ اکتساب اور تحصیل و طلب جو کہیں ہے اور کہیں نہیں ہے، کہیں کم و بیش

لیکن جس طرح باوجود عدم استعداد ہم سائنس اور فلسفہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں شعر اور فن پر وجد کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں یوں ہماری زندگی میں کچھ معنی پیدا ہو گئے۔ ہم نے کچھ پالیا، کچھ دیکھ لیا، لہٰذا اگر حضرات صوفیہ کی زندگی، ان کے اخلاص عمل احوال و واردات سے بھی ہمارے ایمان و یقین کو تقویت پہنچے۔ ہم سمجھیں ہمارا رشتہ کسی حقیقت سرمدی سے قائم ہے اور یہ رشتہ ہمارے لئے تعمیر و ترقی ذات کا ایک قابل اعتماد ذریعہ تو اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ خواہ ہم اس استعداد سے جو با بطبع کہیں ہے، کہیں نہیں ہے۔ بہرہ مند ہوں یا نہیں۔ ہمارے لئے صوفیانہ واردات میں حصول علم اور تربیت ذات کے لامتناہی امکانات موجود ہیں۔ ہمیں چاہیئے ان سے فائدہ اٹھائیں بشرطیکہ ہم اس نکتے کو جس کی اقبال نے بار بار صراحت کی نہیں بھولیں کہ تصوف عبارت ہے اعماق حیات میں شریعت کی دید سے۔ شعور ولایت ہر حالت میں شعور نبوت کی رہنمائی کا محتاج ہے۔

میں آپ کا ممنون ہوں آپ نے میری معروضات کو توجہ سے سنا، صبر و تحمل سے، مکرر شکریہ

والسلام

سید نذیر نیازی

تعلیقات :

۱۔ وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم النّاس بالقسط۔ ۵۷ (الحدید) ۲۵

۲۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس

۳۔ یضع امرھم والاغلال التی کانت علیھم

۴۔ فانہ نزلہ علی قلبک ۳ (البقرہ) ۹۷

۵۔ وقل ربّ زدنی علمًا ط

۶۔ العلق

۷۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ ۱۷ (بنی اسرائیل)۔ ۸۵

۸۔ وکل شیئ احصینہ فی امام مبین۔ ۲۶ (یٰسین)۔ ۱۲